وہ مسلمان اور ہم مسلمان

مولانا عبدالعلی فاروقی (ایڈیٹر البدر گاکوری۔ لکھنؤ)

اسلام کی روشن تاریخ کے حوالوں سے اپنا تعارف کرانے والے ہم مسلمان، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فداکاریوں سے اپنا رشتہ جوڑنے والے ہم مسلمان، اسلاف کرام کی کمائی پر اپنا حق جتانے والے ہم مسلمان اور خون کے رشتوں سے اپنا حق جتانے والے ہم مسلمان اور خون کے رشتوں سے اپنی عظمت کے گیت گانے والے ہم مسلمان آخر "اپنی ذات" کے ذریعہ اپنا تعارف پیش کرنے سے کیوں گھبراتے ہیں؟ ماضی پر فخر کرنے کے بجائے حال کا آئینہ کیوں نہیں دکھا پاتے؟ اور خون کے رشتوں کے بجائے دین کے رشتوں اپنا سلسلۂ نسب کیوں نہیں ظاہر کر پاتے؟ کہیں سچائی وہی تو نہیں جو علامہ اقبال نے اس طرح بیان کردی ہے کہ

تھے تو وہ آباء ہی تمہارے مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو

"فتح روم" کی داستان ہم مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں، ہمارے "جذبۂ فخر" کے لئے حضرت فاروق اعظمؓ کے اس عظیم الشان کارنامہ سے بڑا سامان فراہم ہوجاتا ہے، عیسائیت کے اس سب سے بڑے مرکزی نہیں بلکہ اس وقت کے نقشہ کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھرنا۔ اور عرب کے ایک امی نبی کے "کفن بردوش غلاموں" کے ہاتھوں "سپر پاور" کا بھرم خاک میں مل جانا یقیناً وہ حیرت انگیز کارنامہ ہے جسے تاریخ کبھی فراموش نہ کرسکے گی۔ مگر ہم مسلمانوں کے سامنے یہ ایک سوال ضرور ہے کہ "کل کا مفتوحہ روم" آج کس کے قبضہ واقتدار میں ہے؟ اور کیوں؟

اور اسی کیوں کا جواب حاصل کرنے کے لئے آئیے اس کا پتہ لگائیں کہ روم کو کن لوگوں نے فتح کیا تھا۔ اور ان کے جذبات کیا تھے؟ اتنی بات پہلے ہی ذہن نشین رہنا ضروری ہے کہ روم بس ایک حملہ ہی میں فتح نہیں ہوا تھا بلکہ اس پر بار بار لشکر کشی ہوئی تھی جان و مال کے نذرانے پیش کئے گئے تھے۔ وقت کی عظیم طاقت سے ٹکر لینے کے جرم میں دیوانوں اور سرفروشوں کی ہڈیاں ریزہ ریزہ کی گئی تھیں مگر یہ دیوانے اتنے "بشیار" تھے کہ انہیں "عسر و یسر" یعنی تنگی و خوشحالی ہر دور میں اپنی نسبت و وابستگی، اپنی منزل اور اپنا مقصد یاد رہا۔

یاد رہے کہ روم کی سرحد اسلامی مملکت کے اس صوبہ شام سے ملی ہوئی تھی جس کے گورنر اسلامی تاریخ کے مایۂ ناز مدبر حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما تھے اور انھوں نے فوج و سپاہ اور مال و زر کی کمی کے باوجود اپنی حکمت عملی کے ذریعہ پڑوسی ملک یعنی "سپر پاور روم" پر اپنا دبدبہ قائم کر رکھا تھا اور شاہ روم اپنی تمام تر قوت اور فوج و سپاہ کی فراوانی کے باوجود سہما سہما سا رہتا تھا کیونکہ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اس کے پڑوسی مسلمانوں کو شمشیر و سناں اور فوج و سپاہ سے مرعوب نہیں کیا جاسکتا، ہاں ان کے دل میں

اگر خوف ہے تو اپنے خالق و مالک کا اور محبت و اطاعت کا سیل رواں ہے تو اپنے ہادی و رہبر محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ تاریخ نے محفوظ کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل روم کے درمیان ایک "میعادی نامہ جنگ معاہدہ" ہوا اور طے پایا کہ اس مقررہ مدت کے اندر فریقین ایک دوسرے کے خلاف کسی قسم کی جنگی کارروائی نہیں کریں گے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یہ جانتے تھے کہ یہ "عارضی معاہدہ صلح" صرف وقتی راحت کے لئے ہے اور اس کانٹے کو بالآخر جڑ سے اکھاڑنا ہی ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے معاہدہ کی اس مدت کو اپنے تدبر کے ذریعہ "تیاری کی مدت" کے طور پر گذارا اور اسی دوران اپنی فوج اور فوجی ساز و سامان سرحد پر جمع کرتے رہے کہ صلح کی مدت پوری ہوتے ہی دشمن کو تیاری کا موقع دیئے بغیر حملہ آور ہو کر فتوحات حاصل کرلی جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ "معاہدہ صلح" کی مدت پوری ہوتے ہی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دشمن پر دھاوا بول دیا، شاہ روم اور اس کے حکام اس یلغار کو روکنے کے لئے قطعاً تیار نہ تھے اس لئے پیہم شکست سے دوچار ہوئے۔ دور تک آگے بڑھتے چلے گئے ابھی فتوحات کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کانوں میں صحابی رسول حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کی آواز پڑی جو چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے

"وفا لا غدر وفا لا غدر" یعنی ایمان والوں کے لئے وفاداری سزاوار ہے غداری نہیں۔

حضرت معاویہ نے انہیں روک کر دریافت کیا کہ بات کیا ہے؟

حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ میں نے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "دو قوموں کے درمیان جب صلح کا کوئی معاہدہ ہو جائے تو پھر کوئی فریق نہ عہد کھولے نہ باندھے یہاں تک کہ مدت پوری ہوجائے" ظاہر ہے کہ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کا منشا یہ بتانا تھا کہ فرمان رسول کی روشنی میں "معاہدہ صلح" کے دوران فوج کو کسی بھی طرح حرکت دینا درست نہیں نہ حملہ کرنے کے لئے نہ حملے کی تیاری کے لئے اور "ناجنگ معاہدہ" کے بعد معاہدہ کی مدت کے دوران فوج کو سرحد کی طرف بھیجنا بھی عہد کی پابندی نہیں عہد شکنی اور غداری ہے۔

اپنے آقا کا فرمان سامنے آتے ہی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے "فاتح فوجیوں" کو مفتوحہ علاقہ خالی کرتے ہوئے الٹے پیروں واپسی کا حکم دے دیا اور پھر بدترین دشمن کی زمین پر فتوحات کے جھنڈے گاڑنے والا یہ پورا لشکر کسی ادنیٰ تردد و قائل کے بغیر تمام مفتوحہ و مقبوضہ علاقے خالی کرتا ہوا واپس لوٹ آیا۔ اور یہ واپسی صرف اس لئے ہوئی کہ ان کی نگاہ میں اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا و خوشنودی دنیا کی ہر بڑی سے بڑی فتح سے بالاتر تھی۔

کیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے سوا دنیا کی تاریخ میں کوئی اور بھی ایسی مثال ہے کہ کسی فاتح نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرکے اور اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر حاصل کی ہوئی فتح کو محض ایک اشارہ بلکہ محض ایک جملہ یا زیادہ صحیح لفظوں میں "کسی ایک کی خوشنودی" کی خاطر تج دیا ہو؟

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے عظیم الشان کارنامہ "فتح روم" کی بات چلے تو ہمیں اسلام کے جاں باز سپاہی، عاشق صادق اور صحابی رسول حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کے اس "مومنانہ کردار" پر بھی غور کرنا چاہیئے جو انہوں نے شاہ روم کے روبرو پیش کر کے فتح و شکست کا اصل راز دنیا کو بتایا تھا۔ واقعہ یوں ہوا کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے حکم سے ایک اسلامی لشکر نے روم پر چڑھائی کی مگر اس مہم میں کوئی بڑی کامیابی نہ مل سکی اور بہت سے مسلمان مجاہدین قید کر لئے گئے۔ ان ہی قیدیوں میں حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

جب شاہ روم کو ان کی اہمیت اور "خصوصی حیثیت" کے بارے میں پتہ چلا تو اس نے انہیں بطور خاص اپنے دربار میں طلب کر کے ان سے کہا "اگر تم اپنا دین (اسلام) چھوڑ کر عیسائیت قبول کر لو نہ صرف یہ کہ میں تمہیں رہا کر دوں گا بلکہ تمہیں اپنی بادشاہت و سلطنت میں بھی حصہ دار بنالوں گا۔ اور اگر تم اس پیشکش کو قبول نہیں کرو گے تو یقیناً تمہیں قتل کرا دوں گا"۔

حضرت عبداللہ نے یہ سن کر برجستہ فرمایا۔ تمہاری دھمکی یا لالچ کا ہم دل والوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے اگر تم اپنی پوری سلطنت بھی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کے عوض دے دو تو بھی ایک پل کے لئے بھی میں تمہاری پیشکش کو قبول نہیں کروں گا اور اس دین اور اس مبارک نسبت پر اپنی جان قربان کر دینا اپنے لئے باعث سعادت قرار دوں گا۔

بھرے دربار کے اندر شاہ روم جیسے پرشکوہ اور ظالم حکمران کو طیش میں لانے کے لئے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا یہ "ٹکا سا جواب" بہت کافی تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً حکم دیا کہ

"ان کو سولی پر لٹکا کر ان کو تیروں سے چھیدو مگر یاد رہے کہ ہمارا مقصد انکی جان لینا نہیں بلکہ ان کے دین سے ہٹا کر اپنے دین میں شامل کرنا ہے۔ پس جوں ہی یہ اس کے لئے آمادہ ہو جائیں انہیں سولی سے اتار دینا"۔

شاہی حکم کی تعمیل شروع ہوئی، تیروں کی بارش ہونے لگی، ساتھ ہی بار بار یہ بھی کہا جاتا رہا کہ "اب بھی ہمارا مذہب قبول کر کے اپنی جان پر رحم کرو"۔ مگر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا وہی ایک جواب کہ دین کی نسبت پر جان دینا تو جان کی سوارتی ہے، پھر میں کیوں کر اس سے پھروں؟

بادشاہ کو جب اس ثابت قدمی اور والہانہ جذبہ فدائیت کی اطلاع دیتے ہوئے بتایا گیا کہ اس دیوانے کو تو اپنی جان کی مچھر کے پر کے برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔ پھر بھلا اسے اس کے دین سے کیونکر پھیرا جاسکے گا؟ تو یہ سن کر وہ غصہ میں تلملا اٹھا اور ایذا رسانی کا نیا حکم یوں جاری کیا کہ

"دیگ میں پانی کھولا کر اس کھولتے ہوئے پانی میں ان کے سامنے پہلے ان کے ساتھی کو ڈالو اور جب وہ ساتھی اپنے انجام کو پہنچ جائے تو پھر اسی طرح ان کو بھی ایسے ہی پانی میں ڈال کر ختم کر دو"

کارندوں نے فوراً تعمیل حکم کرتے ہوئے گرم اور کھولتے ہوئے پانی میں حضرت عبداللہ کے سامنے ان کے ایک ساتھی کو ڈال دیا حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ کھال جلی، گوشت جلا، چربی پگھلی اور ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو کر پانی میں مل گئیں۔

ایک انسان دوسرے انسان پر اور ایک مومن بھائی دوسرے مومن بھائی پر ظلم کے یہ پہاڑ ٹوٹتے دیکھنے پر مجبور ہو تو اسکے دل پر کیا گذرے گی؟ اور پھر جب اس سے یہ کہا جارہا ہے کہ اگر تم بادشاہ کا کہنا نہیں مانو گے اور اپنی ضد پر قائم رہو گے تو تم کو بھی یہی سزا ملے گی۔ مگر واہ رے عشق رسول اور اس کی سرمستی کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاؤں میں ذرا بھی لغزش نہ آئی اور اس دلدوز اور انسانیت سوز منظر کو دیکھ کر بھی نہ وہ اپنی بات سے پھرے نہ ہی ان پر خوف کے کچھ آثار ظاہر ہوئے۔

بالآخر انہیں بھی کھولتے ہوئے پانی میں ڈال کر کھلا دینے کی غرض سے لے جایا گیا۔ مگر انہیں جوں ہی وہ دیگ کے قریب پہنچے زار و قطار رونے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر ظلم کے لئے بڑھتے ہوئے ہاتھ فوراً رک گئے، اس لئے نہیں کہ ان کے دل "رحم آشنا" ہو گئے بلکہ اس لئے کہ امید کی ایک کرن پھوٹی کہ شاید عبداللہ موت سے ڈر کر ہمارا مذہب قبول کرلیں۔

جھٹ پٹ بادشاہ کو اطلاع دی گئی اور خوش خوش رہائی کا حکم لئے عبداللہ کے پاس آگیا اور بولا کہ تم پہلے ہی میری بات مان لیتے تو تمام تکلیفوں سے بچ جاتے، اچھا خیر اب بھی وقت ہے بہتر ہوا کہ تم اپنی ضد سے باز آگئے اور ہمارا دین قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

بادشاہ کی بات سنتے ہی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ تڑخ کر بولے، ایسا کچھ نہیں ہے، تم اپنی اس غلط فہمی کو دور کرلو کہ مرا رونا موت سے ڈر کر تھا۔ بلکہ میں رویا تو یہ سوچ کر تھا کہ میرے پاس ایک ہی تو جان ہے جو ابھی نکل جائے گی اور میرا جسم جل بھن کر ختم ہو جائے گا اور بس کہانی ختم۔ کاش کہ میرے پاس جسم کے بالوں کی تعداد میں جانیں ہوتیں اور میں ایک ایک کرکے وہ تمام جانیں اس دین برحق اور اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پر نچھاور کر دیتا۔

ایک "ایمان والے" کی یہ نرالی اور والہانہ ادا دیکھ کر شاہ روم کے لئے اپنا منہ پیٹ لینے کے سوا چارہ کیا تھا؟

حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کی اس داستان رنج و محن اور ثبات و عزیمت کا ابھی کافی حصہ باقی ہے۔ لیکن اسی جگہ ٹھہر کر سوچنے کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے صاحب جبروت بادشاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے، اور اس کے ظلم و ستم کے تمام ہتھیاروں کو اپنی ایک جان ناتواں پر جھیل کر ناکام بنا دینے کا یہ حوصلہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو کہاں سے اور کیونکر ملا؟

فتح روم کے سلسلہ میں مندرجہ بالا دونوں واقعات ہی کو سامنے رکھ کر ہم اپنے حالات کا تجزیہ کریں تو بات بالکل عیاں ہو جائے گی ہم "فخر پسند" مسلمانوں کے لئے "فتح روم" بڑا کارنامہ اور لائق صد افتخار واقعہ ہے۔ جبکہ "فاتحین روم" کے لئے اس کی حیثیت نہ کسی کارنامہ کی تھی نہ ہی اس پر ان کی نگاہ گئی بلکہ ان کا مرکز نگاہ اور سرمایہ، فخر دین اور صرف دین تھا کہ جس کی سربلندی پر وہ شاداں و فرحاں بھی ہوئے اور اس کے لئے وہ اپنے جسم اور اپنی جان کو لئے ہوئے کوشاں بھی رہے۔ جبکہ ہم؟؟

اب فیصلہ ہمیں خود کرنا ہے کہ ان "قدوسیوں" سے اپنا رشتہ جوڑنے میں کیا ہم حق بجانب ہیں؟ اور اگر نہیں تو اپنا "سلسلۂ نسبت" درست کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے؟"